تار کا پتہ
"انجمن" علی گڑھ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

فی پرچہ دو آنے — سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۴ | ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء | اڈیٹر۔ قاضی عبدالغفار | ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۷۴ھ | نمبر ۴

لسانی اقلیتیں

بہار کے چیف منسٹر ڈاکٹر سری کرشن سنہا نے ایک پریس کانفرنس میں علاقائی زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی حکومت نے ریاستی تنظیم کے کمیشن کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو لسانی صوبوں میں لسانی اقلیتوں کی زبان کی حفاظت کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم نے ریاستوں میں لسانی اقلیتوں کے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کی مشکلات پر توجہ دلائی ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ کسی لسانی اقلیت کی تعداد ایک صوبے میں کم ہو یا وہ کسی ریاست کے وسیع رقبے میں منتشر ہوں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ایسی اقلیتوں کو خود اپنے مدارس میں اپنی ہی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر جاری کرنے کی تمام سہولتیں دی جائیں۔"

اگر لسانی اکثریت کے اعتبار سے ریاستوں کی تقسیم کی جائے تو یقیناً ہر ریاست میں ایسی لسانی اقلیتیں باقی رہیں گی۔ مثلاً ریاست بمبئی کو لیجئے جہاں کم و بیش بارہ لسانی اقلیتیں ہر حال میں باقی رہیں گی جن کی یہ خواہش ہوگی کہ ان کی مادری زبان محفوظ رہے اور وہی ان کے بچوں کے لئے ذریعہ تعلیم ہو۔ ریاستوں کی لسانی اعتبار سے کسی طرح بھی تقسیم کی جائے لسانی اقلیتوں کا وجود ہر ریاست میں باقی رہے گا اور یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کو ترک کر کے اکثریت کی زبان اختیار کر لینے پر آمادہ کی جا سکیں۔ ہر زبان کے ساتھ ملک کے مختلف فرقوں کی روایات اور تاریخ وابستہ ہے اور یہ روایات صدیوں سے مادری زبان کے گرد و پیش جمع ہوتی رہی ہیں۔ کسی ریاست میں کوئی اکثریت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ لسانی اقلیت اپنی زبان کو ترک کر دے۔ یہ صورت حال کوئی نئی بات نہیں ہے جو سیاسی انقلاب کے ساتھ پیدا ہوئی ہو یہ سب تو اس ملک کی قدیم تاریخ کے اہم اجزا ہیں۔ ناخن سے گوشت جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایسی کوشش نہایت احمقانہ ہوگی۔ ریاستوں کی لسانی تقسیم ہندوستان کے قومی اتحاد کے لئے زہر ثابت ہوگی۔ اور اگر ایسا ہوا تو لسانی اقلیتوں اور لسانی اکثریت کے درمیان ایسی کشمکش پیدا ہوگی جو قومی اتحاد کی مرکزیت کو فنا کر دے گی۔

اترپردیش میں بعض کم فہم اور کم نظر دوستوں نے اردو زبان کے ساتھ کچھ اسی قسم کی تنگ نظری کا اصول اختیار کر رکھا ہے لیکن یہ عمل خود اکثریتی زبان کے مفاد کو نقصان پہنچا رہا ہے اور ان دوستوں کی کج فہمی سے اس ریاست میں جو ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے ایک لسانی تقسیم پیدا ہو رہی ہے جو کسی نہ کسی دن قومی اتحاد کی مرکزیت کو صدمہ پہنچائے گی۔ جس قدر جلد اس خطرے کو سمجھ لیا جائے اسی قدر قومی وحدت کی تعمیر میں آسانی ہوگی۔ سب سے پہلے اتر پردیش ہی کے لیڈروں کو اس پہلو پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اسی ریاست سے لسانی تعصبات کے سب سے زیادہ مظاہرے شروع ہوئے ہیں۔

"برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس"

سنا گیا ہے کہ اس نام کا ایک ادارہ علاقہ برار میں عرصے سے قائم ہے۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں اس کانفرنس کا ایک اجلاس آکولہ میں زیر صدارت ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم ہوا تھا۔ اب ۳۶ برس بعد اس بات کی کوشش میں اُبال آنے کی خبریں سنی جا رہی ہیں اور اس اجلاس کی صدارت کے لئے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام لیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ایک ممتاز ماہر تعلیمات ہیں بلکہ ادارہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر بھی ہیں۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ برار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مجوزہ اجلاس کے سلسلے میں بعض مقامی حضرات نے یہ بھی چاہا تھا کہ مدھیہ پردیش کی ایک اردو کانفرنس بھی منعقد کی جائے۔ لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کے بااثر حضرات نے اس تجویز کو پسند نہیں کیا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے برار کی اس ایجوکیشنل کانفرنس میں اردو زبان کے متعلق کوئی شعبہ بھی نہیں ہے۔ اور نہ کانفرنس کا کوئی تعلق علی گڑھ کی مرکزی ایجوکیشنل کانفرنس سے ہے۔ یہ بھی ہمیں معلوم نہیں کہ سنہ ۱۹۱۹ء سے اس وقت تک اس ادارے نے برار میں کیا تعلیمی خدمات انجام دی ہیں۔

ہمارے لئے خاص طور پر جو چیز حیرت انگیز ہے وہ اس کانفرنس کی اردو زبان سے بے تعلقی ہے۔ مدھیہ پردیش میں اردو کا مسئلہ اُلجھتا چلا جا رہا ہے۔ اور حال ہی میں ناگپور کی کارپوریشن نے اردو کے اسکولوں کو بند کرنے کا فیصلہ کر کے ایک افسوسناک صورت حال پیدا کر دی ہے لیکن اس سلسلے میں بھی ایجوکیشنل کانفرنس کا نام کہیں سننے میں نہیں آیا۔ اب جبکہ محترم ڈاکٹر ذاکر حسین سے آئندہ اجلاس کی صدارت کی درخواست کی جا رہی ہے تو کانفرنس کے کارکن اس بات کو کس طرح نظر انداز کر سکے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑے اردو ادارے کے صدر ہیں اور اتر پردیش میں اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کی تحریک کے رہنما ہیں۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ برار کی ایجوکیشنل کانفرنس کے ذمہ دار کارکن کون حضرات ہیں تو ہم ان سے براہ راست ضرور دریافت کرتے کہ وہ مدھیہ پردیش میں اردو کے مسئلے سے کیوں اس قدر بے پروا ہیں۔ بہرحال اگر ان کی نظر سے یہ استفسار گزرے تو بڑی مہربانی ہوگی اگر وہ ہمیں بتائیں کہ اردو کے مسئلے سے کانفرنس کی اس بے تعلقی کی حقیقت کیا ہے۔

مسلمانوں کے ایسے تعلیمی ادارے پر جو اردو زبان کے مسئلے سے بے تعلق رہ کر کوئی قومی خدمت کرنا چاہے تنگ نظری اور ایک اہم اور بنیادی قومی مسئلہ سے بے پروائی کا الزام عاید ہو سکتا ہے۔

اسی اشاعت میں کسی دوسرے صفحہ پر ہم ایک نامہ نگار کے بیان کا ملخص درج کرتے ہیں جس میں چند سوالات کئے گئے ہیں جن کا جواب برار ایجوکیشنل کانفرنس کے کارکنوں کو دینا چاہئے۔

سعادت حسن منٹو!

افسوس ہے کہ محفل ادب کا ایک اور ستارہ غروب ہو گیا۔ منٹو کی شخصیت بہ حیثیت ایک ادیب بہت سے بحث طلب مسائل کا مرکز رہی ہے۔ پھر بھی اس میں تو کلام نہیں کہ ان کا قلم طاقتور تھا اور ادبی حلقوں میں انھوں نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔ مرحوم ایک کشمیری گھرانے کے فرد تھے۔ وہ سنہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی عمر ۴۲ سال ہوئی۔ ابھی ان کی جینیس کے لئے ادب اور قلم کا بہت بڑا میدان کھلا ہوا تھا۔ جو کچھ انھوں نے لکھا۔ اس کی نمایاں خصوصیت ان کی انفرادیت تھی۔ ادب کے متعلق اپنے نظریات کا انھوں نے پوری جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا اور جو راہ اختیار کی تھی اس سے نہیں ہٹے انھوں نے اپنی ادبی اور صحیفہ نگاری کی زندگی میں اپنے زور قلم کا ایسے نشانات چھوڑے ہیں جو ادیبوں کی دنیا میں کتنے ہی بحث طلب ہوں۔ لیکن باقی رہنے والے ہیں۔

ہلکے ہلکے اشارے

—— یونین کے ڈپٹی منسٹر امیر پارلیمنٹ نے فرمایا کہ صوبائی اسمبلیوں میں انگریزی کی جو اصطلاح (ہندسہ) ڈپٹی اور (ہندسہ) چیف ڈپٹی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے بجائے ہندی اصطلاح "سچیتک" اور "ڈپٹی سچیتک" بہت پُر معنی ہے اور اس میں تازگی ہے۔

—— پُر معنی ہے یا نہیں لیکن "تازگی" تو ہم بھی محسوس کرتے ہیں اگر اسی ڈھنگ سے سرکاری زبان میں "تازگی" پیدا ہوتی رہی تو دیکھنا ہے کہ سرکاری زبان عوامی اور قومی کس طرح بنے گی!

—— انگریزی کو بے دخل کرنے کا جذبہ ایک حد تک صحیح بھی ہو لیکن انگریزی اصطلاحوں کو ہندوستان کی زبان سے یکسر خارج کرنے پر اصرار ایسی تنگ دلی پر گواہ ہے جو کبھی کسی زبان کی ترقی کا وسیلہ نہیں ہو سکتی!!

—— مگر یہ تو سب نیتاؤں اور حاکموں کی باتیں ہیں، ہم دخل دینے والے کون؟

——— ہم سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ "بزار سلم ایجوکیشنل کانفرنس" جس کے سالانہ جلسے کا زیر صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین اعلان کیا جا رہا ہے، یہ کیا چیز ہے؟ کیا اس کا کوئی شعبہ زبان اردو کے متعلق بھی ہے؟ یا اس کا کوئی تعلق علی گڑھ کی مرکزی ایجوکیشنل کانفرنس سے بھی ہے۔

——— کسی صاحب کو اگر علم ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں۔

——— دہلی کی جن سنگھ نے اعلان کیا ہے کہ وہ دکانوں پر سے اردو کے سائن بورڈ ہٹانے کی تحریک شروع کرے گی!

——— کتنے بڑے بڑے کام ان قومی اداروں کے سامنے ہیں بشلاً محلوں اور سڑکوں کے نام بدلنے، اردو کے سائن بورڈ ہٹانے وغیرہ وغیرہ ——— اور گویا یہی نئے ہندوستان کی تعمیر کا کام ہے!!

اللہ تعالیٰ حماقتوں کی ڈوری بھی بہت لمبی رکھتا ہے۔

کول صاحب کے انتقال پر

پروفیسر سید احتشام حسین

کول صاحب کے انتقال سے ان کے تمام جاننے والے کو اپنے ذاتی نقصان کا احساس بھی ہوگا اور اردو زبان و ادب کا کام کرنے والوں کو اجتماعی نقصان بھی۔

"میں نے انہیں جیسا کچھ پایا اور دیکھا تھا اس پر نظر رکھتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی جگہ بہت دنوں تک خالی رہے گی۔"

چھوٹے بڑے جلسوں میں، کانفرنسوں میں انجمنوں میں جب کبھی ان کا ساتھ ہوا تو یہی محسوس ہوا کہ ان کے دل میں وہ مقدس آگ ہے جسے زندگی کو خوش تر اور ادب کو حسین تر بنانے کی لگن کہہ سکتے ہیں، مجھ سے زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک رہی ہے۔ اس عمر میں، صحت کی خرابی کی حالت میں، گوناگوں مصروفیات کے درمیان وہ جس انہماک سے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کر رہے تھے اس سے بہت سے نوجوانوں کے سینے خالی ہیں۔ اس لئے ان کی موت کا خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اس صحت مند خواہش پر ضرب لگی۔

ادھر کئی کانفرنسوں اور جلسوں میں کول صاحب مرحوم کے ساتھ جانے اور شریک ہونے کا موقع ملا۔ ان کی باقاعدگی، وقت کی پابندی، وضع کا رکھ رکھاؤ، تھکن کے باوجود دوسروں کی خدمت کے لئے آمادگی یہ ساری باتیں آئینہ کی طرح روشن ہو گئیں۔ حیدرآباد اور پٹنہ کے ان سفروں میں ان سے ادبی، علمی، سیاسی، مذہبی اور گھریلو باتیں ہوئیں۔ اور میں نے دیکھا کہ ہر جگہ ان کا خلوص، اور صداقت کا جذبہ دوسرے جذبات پر حاوی ہے۔

ایک مشترکہ بیان

قومی کارکن گیانی مہندر سنگھ اور اردو تحریک کے رکن مسٹر شجاعت علی نے ایک مشترکہ بیان میں اردو تحریک کے قائد اور اردو کی ناؤ کھیون ہار پنڈت کشن پرشاد کول کی جدائی کو اردو اور اردو والوں کے لئے ناقابل برداشت صدمہ قرار دیا ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے "اس وقت ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ انھوں نے ہمت مردانہ سے کام لے کر اردو پر ہونے والے حملوں کا مقابلہ کیا، یہی وہ مرد مجاہد تھے جو حکومت اور دشمنان اردو کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر آگے ۔ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود جس خوبی سے وہ مسلسل کوشش کرتے رہے اور اردو والوں کی رہنمائی کرتے رہے اس سے ان کے خلوص، ان کی انسانیت، ان کی جمہوریت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یونیورسٹی میں تعزیتی جلسے

لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو فارسی سوسائٹی کا ایک خاص جلسہ ہوا جس میں پنڈت کشن پرشاد کول کی موت پر اظہار افسوس کیا گیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبۂ فارسی و اردو نے کی۔ سید احتشام حسین نے جلسے میں حسب ذیل تجویز پیش کی۔

"اردو فارسی سوسائٹی لکھنؤ یونیورسٹی کا یہ خاص جلسہ پنڈت کشن پرشاد کول کے انتقال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اسے اردو زبان و ادب کے لئے ایک بڑا سانحہ سمجھتا ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول ہندوستان کی مشترک تہذیب کے ایک قابل قدر اور مایہ ناز فرزند تھے۔ ان کی ساری زندگی ملک و قوم کی تہذیبی اور ادبی خدمت میں گزری۔ وہ اردو زبان و ادب کے عاشق بھی تھے۔ اور مجاہد بھی۔ انھوں نے اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے دستخطی مہم کی قیادت کر کے اسے کامیابی تک پہنچایا اور انجمن ترقی اردو (ہند) اور صوبائی انجمن کے ہر اقدام میں پوری طرح شریک رہے۔ وہ نہایت مستقل مزاج، پرخلوص اور انتھک کام کرنے والے آدمیوں میں تھے۔ اور ان کی ساری زندگی جوان نسل کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہے۔

یہ جلسہ ان کے پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور ان کے غم میں ان کا شریک ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے پنڈت کول کی ذاتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔

شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں چکبست سوسائٹی کے

ممبروں کا ایک جلسہ آج ساڑھے دس بجے دن میں ہوا جس میں پنڈت کشن پرشاد کول کی ناگہانی وفات پر اظہار افسوس کیا گیا اور اس کو اردو زبان کے لئے ناقابل تلافی نقصان بتایا گیا۔ تجویز میں کہا گیا ہے۔

"پنڈت جی کی ناگہانی وفات سے صرف اردو کو ہی نقصان نہیں پہنچا بلکہ عام سوشل کلچرل سوسائٹی کو صدمہ پہنچا ہے۔"

ممتاز ہائر سکنڈری اسکول کے طلباء اور اساتذہ کے ایک جلسے میں پنڈت کشن پرشاد کول کی ناوقت اور اچانک وفات پر اظہار افسوس کیا گیا۔ جس میں پرنسپل نے پنڈت جی کی سماجی اور تعلیمی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"پنڈت جی نے مختلف حیثیتوں سے زندگی بھر جو ملک و قوم اور اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ وہ سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔"

سلم پروگریسیو یونین لکھنؤ کے ایک تعزیتی جلسے میں جو سجاد نگر میں ہوا پنڈت کشن پرشاد کول کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

ادارے کے سکریٹری منظہر الحسینی ریاحی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"آج ہمارا ایک بہت بڑا رہنما اور اردو زبان کا حامی و علمبردار ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ ہم کول صاحب کا جتنا بھی غم منائیں کم ہے۔"

مزدور لیڈر کا بیان

مقامی ہریجن و مزدور کارکن مست قرائن شوشت نے ایک بیان میں کہا ہے۔

"تبدیل شدہ سیاسی حالات میں اردو کے لئے جیسی اللہ شہر و کی حمایت حاصل کرنا تاریخی کارنامہ تھا۔ اردو علاقائی زبان کے مطالبہ کی مقبولیت پنڈت کشن پرشاد کول کی حقیقی یادگار اور ان کی روح کی شانتی کا ذریعہ ہے۔"

بھائی چارہ لیگ

دفتر بھائی چارہ لیگ میں پنڈت کشن پرشاد کول کی اچانک انتقال کی خبر انتہائی رنج و حسرت کی فضا میں سنی گئی جس کے فوراً ہی بعد ایک جلسہ تعزیت زیر صدارت وحید الحسن لاہرپوری جنرل سکریٹری ہوا جس میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

انجمن بہار ادب

انجمن بہار ادب کا ایک غیر معمولی جلسہ زیر صدارت جناب عرشی صاحب حکیم ... صاحب کے مکان پر ہوا جس میں محسن اردو پنڈت کشن پرشاد کول کے سانحہ انتقال پر رزولیوشن پاس کیا گیا۔

کانپور

کانپور ۱۵ جنوری۔ انجمن تحفظ اردو یوپی کے صدر دفتر نے پنڈت کشن پرشاد کول کے حادثہ انتقال پر ایک تعزیتی بیان بغرض اشاعت اخبارات کو بھیجا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پنڈت کشن پرشاد کول کی وفات نے مادر وطن کی گود سے ایک انمول ہیرا چھین لیا ہے اور ان کی بے وقت موت ملک کے لئے ایک سانحہ عظیم کی حیثیت رکھتی ہے۔

گورکھپور

گورکھپور ۱۵ جنوری۔ یہاں گورکھپور لٹریری سرکل کا ایک جلسہ ہوا جس میں انجمن ترقی اردو یوپی کے صدر پنڈت کشن پرشاد کول کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کیا گیا۔

بزم ادب لکھنؤ

اتر پردیش بزم ادب کا ایک ہنگامی جلسہ ہوا جس میں پنڈت کول کے انتقال کو ایک ناقابل تلافی نقصان نہ صرف اس تحریک کے لئے جس کے وہ پیشوا تھے بلکہ پورے اردو ادب کے لئے بتایا گیا۔

انجمن فروغ ادب

پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کی وفات کی خبر سن کر اراکین ادارہ فروغ اردو نے ایک تعزیتی جلسہ کیا جس میں کول صاحب کی اردو نوازی کو سراہا گیا۔ مولانا شمس کاکوروی منیجر نے کول صاحب کی وفات کو دنیائے اردو کے لئے ایک سانحہ عظیم بتایا۔ مسٹر شجاعت سندیلوی معاون مدیر فروغ اردو نے کول صاحب کا اس نازک دور میں اٹھ جانا ناقابل تلافی نقصان بتایا۔

اسلامیہ کالج لکھنؤ

اسلامیہ کالج لکھنؤ کے اساتذہ اور طلبا کا ایک تعزیتی جلسہ پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کی وفات کے سلسلے میں منعقد ہوا جس میں ایک تجویز تعزیت منظور ہوئی۔

ادارہ ایوان ادب

آج ادارہ ایوان ادب کا بھی ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں کول صاحب کے انتقال پر سخت افسوس ظاہر کیا گیا۔

خطبۂ صدارت

آل انڈیا اردو کانفرنس، مدراس ۶ فروری ۱۹۵۵ء

از- قاضی محمد عبدالغفار

دوستو!

صدارت کے لئے انتخاب کا شکریہ ادا کرنا ایک قدیم رسم ہے میرے اجزائے ایمان میں "ترک رسوم" کو بہت اہمیت حاصل ہے اس لئے شکریہ اور تشکر کے اظہار کی طوالت سے قطع نظر کرکے میں آپ سے کچھ کام کی باتیں کرتا ہوں۔

یوں تو ایک دفعہ سے زیادہ مدراس آچکا ہوں لیکن عرصے سے یہ خواہش تھی کہ مدراس میں اردو زبان کی توسیع اور ترقی کی تحریک کے سلسلے میں ایک دفعہ یہاں آؤں اور مدراس کے ارباب ذوق سے دو باتیں کروں۔ مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور میرے محترم افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کی عنایت سے مجھے یہ موقع مل گیا اور باوجود میری صحت اتنے لمبے سفر کی حریف نہ تھی لیکن آپ سے ملاقات کے شوق نے میرے جسمانی ضعف کو شکست دی۔

مدراس میں اردو زبان کی تاریخ کم و بیش چار صدیوں کی تاریخ ہے۔ سترھویں صدی کے شروع میں کرناٹک مغلوں کی سلطنت کا جزو بنا۔ اس کے بعد دکن کے ناظم آصف جاہ اول نے اس صوبے کے لئے صوبہ دار مقرر کرنے شروع کئے اور اس طرح دکن اور مدراس کی قدیم تہذیبیں ایک دوسرے سے قریب آئیں۔ جب دکن میں آصف جاہ کے جانشینوں کا اقتدار کمزور ہوا اور اس ملک میں قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان کشمکش شروع ہوئی تو یہی زمانہ دکن میں اردو کے شباب کا زمانہ تھا۔ اور اسی طرح اسی زمانے کے سیاسی طوفانوں میں یہ زبان "پروردۂ آغوش موج" بن گئی۔

یہ گمان کیا جاتا ہے کہ بہمنی سلطنت کے توسط سے یہاں گو یا اردو اسی زمانے میں پہنچ چکی تھی۔ لیکن ارکاٹ اور کرناٹک کے متعلق ایسی کوئی تاریخی سند حاصل نہ ہو سکی۔ عادل شاہی دربار کے ملک الشعراء نصرتی کے متعلق بھی یہ گمان کیا جاتا ہے کہ ان کا وطن کرناٹک تھا۔

مدراس کے پہلے شاعر جن کا پتہ چلتا ہے عبدالمومن مومن تھے (۱۰۴۲ھ) ان کے بعد تو سترھویں صدی کے آخر سے اٹھارہویں صدی کے آخر تک شعراء اور ارباب ذوق کا ایک سلسلہ قائم رہا۔ جنھوں نے شاعری کے ذریعے سے اردو زبان کی تدریج و ترقی کا شاندار کام انجام دیا۔ ان ہی میں بہت نمایاں باقر آگاہ تھے جو بڑے صاحب ذوق استاد حضرت ابوالحسن قربی کے شاگرد اور مرید تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی نواب مستقیم جنگ نامی اور ولی ویلوری بھی تھے جن کا نام اردو زبان کے معماروں میں شامل ہے۔ حکمران خاندانوں کے ذوق و شوق نے شعراء کی یہ ایک شاندار محفل قائم کر دی۔ زبانوں کی تاریخ میں یہ پہلو نمایاں ہے کہ بیشتر اوقات زبان کی ترقی کا آغاز نظم سے ہوا ہے اور نثر بعد میں آئی ہے۔

یوں تو کہا جاتا ہے کہ مدراس میں اردو نثر نگاری کا آغاز ۸ ویں صدی ہجری سے ہو چکا تھا اور اس وقت بعض اہل قلم اردو کو ہندی اور ہندوی کے نام سے یاد کرتے تھے جو اس کا اصلی نام تھا مگر باقر آگاہ نے اردو نثر کو سب سے زیادہ مقبول بنایا۔ اس زمانے میں محمد علی والا جاہ کرناٹک کے فرماں روا اور علم اور ادب کے بہت بڑے قدردان تھے۔ ان کی سرپرستی میں اردو کی محفلوں نے روشنی اور رونق حاصل کی۔ باقر آگاہ تقریباً ۳۰۰ کتابوں کے مصنف تھے۔ انھوں نے اردو نثر و نظم کی تقریباً بیس کتابیں لکھیں اور غالباً وہ پہلے ہی ادیب تھے جنھوں نے فارسی کو ترک کر کے اردو نثر لکھنی شروع کی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دیوان کا ایک طویل دیباچہ بھی اردو نثر ہی میں لکھا۔ اسی دور میں قاضی بدرالدولہ بھی ایک بڑے نثر نگار گزرے ہیں جن کے ادب کے نمونے قدیم مطبوعات میں ملتے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی تک نظم و نثر کا چرچا جاری رہا۔ لیکن شروع میں جو اثر مدراس کی شاعری پر میر و سودا کا اور ان کے ذریعے سے دہلی کی زبان پر پڑا تھا وہ تیرھویں صدی میں کم ہونے لگا۔ یہ زمانہ شمالی ہند میں جرأت، انشا اور مصحفی کا زمانہ تھا۔ ان کے اتباع میں مدراس کی شاعری میں بھی تصنع اور مبالغہ زیادہ پیدا ہو گیا اور اردو ادب اپنی سطح سے کچھ نیچے آ گیا۔ ساتھ ہی غیر ملکی اقتدار کے قائم ہونے کے بعد انگریزی زبان کا اقتدار بھی قائم ہونے لگا۔ اور اس طرح مدراس میں اردو ادب کا انحطاط شروع ہو گیا۔ مدراس کے اہل قلم اور ادیب زیادہ تعداد میں حیدرآباد جانے لگے۔ جہاں مختارالملک ان کے بڑے قدردان موجود تھے۔ لیکن باوجود اس کے کہ مدراس میں اردو کا چرچا چودھویں صدی میں بہت کم ہونے لگا تھا۔ اس علاقے میں اچھے شعراء اور نثر نگاروں کی کافی تعداد موجود رہی مثلاً شاطر، پرتو، بادشاہ، ایمان، گوہر، عباسی، بیخود، ذوقی، رزمی، کمالی، نظمی، رازی، نعیم، زومی، نیاز، قدسی، رشید، خاطر، فیاض، برق، مولوی محمود، شمس العلماء قاضی عبداللہ، قدرت، علیم، سید بشیر قطب الدین، محمد علی خاں، عبدالجبار شاکر، مرزا غلام عباس، سید صبغت اللہ حسینی، محمد صالح غنی، حبیب اللہ ارشد، شمس العلماء نواب عبدالرحمن شاطر، نواب تجمل حسین خاں ایمان وغیرہ۔

ان ادیبوں میں بادشاہ کی ایک خصوصیت بہت نمایاں تھی جس

کی وجہ سے اہل دکن ان کو "حالی مدراس" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ باد شاہ قومی نظمیں لکھتے تھے اور مسلمانوں کی زندگی کا کوئی مسئلہ اور کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس پر وہ اپنے قلم کی قوت صرف نہ کرتے ہوں۔ ۱۹۱۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹ویں صدی عیسوی میں اردو ادب اور مدراس کی قومی زندگی میں ایک اور نیا عنصر نمایاں ہوا۔ اردو نثر کے میدان میں اب صحافت کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ یہ تو یقین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ مدراس میں سب سے پہلا اردو اخبار کون سا تھا۔ اور کب شائع ہوا۔ لیکن ۱۸۵۶ء میں گارساں دتاسی نے عمدۃ الاخبار کا نام لیا ہے غالباً عمدۃ الامراء نواب محمد علی خاں ناظم ارکاٹ کے نام سے منسوب تھا۔ اسکی تاریخ اشاعت معلوم نہیں۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ یہی مدراس میں اردو کا پہلا اخبار تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا اعظم الاخبار کو پہلا اخبار بتایا ہے اور اس طرح مدراس میں گویا ۱۸۴۸ء سے اخبار نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اردو صحافت کی تاریخ پر آج تک کوئی تحقیقاتی کام نہیں ہوا ہے۔ لیکن اردو زبان اور اس تہذیب اور کلچر کی تاریخ سے جو اردو زبان سے قریبی نسبت رکھتی ہے۔ صحافت کا بہت گہرا تعلق ہے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور قومی سیاست کی تاریخ بغیر اس کے نامکمل رہے گی۔ اگر مدراس میں ۱۸۴۸ء ہی میں اردو صحافت کا آغاز سمجھا جائے تب بھی سو سال سے زیادہ کی تاریخ اس صحافت سے وابستہ ہے۔ کیا اچھا ہو کہ مدراس کے کچھ اصحاب فکر و نظر مدراس میں اردو صحافت کے متعلق جس قدر معلومات ہو سکے جمع کر لیں ورنہ جتنا زمانہ گزرتا جائے گا یہ قدیم نقوش مٹتے جائیں گے اور ہماری قومی تاریخ کا یہ بہت اہم گوشہ خالی رہ جائے گا۔

ابتدائی زمانے میں مدراس کی صحافت کا جس طرح کہ تمام ہندوستان کی صحافت کا مقصد دربار داری اور امراء اور رؤساء کی تعریف و تحسین یا مذمت کر کے کچھ روپیہ حاصل کرنا ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں قومی احساسات اور سیاسی مسائل کی بھی جھلک اخباروں کے صفحات پر نظر آنے لگی۔ جنگ روم و روس کے زمانے میں ترکوں کی حمایت کا جذبہ بہت نمایاں ہوا چنانچہ شمس الاخبار نے تو ترکوں کے لئے روپیہ جمع کر کے بھیجا۔ جس کے صلے میں اڈیٹر کو سلطان عبدالحمید خاں نے تمغۂ مجیدیہ دیا۔ جس کا عکس اس اخبار کے سر ورق پر شائع ہوا کرتا تھا جس طرح مدراس میں صحافت کا تدریجی ارتقاء ہوتا رہا اسی طرح بنگلور اور میسور میں نئے نئے اخبار نکلنے شروع ہوئے جن میں ... خاص طور پر ... مسائل پر بھی تبصرہ کیا کرتا تھا۔ ۱۸۸۰ء کے بعد عیسائی مشنری بھی اس میدان میں آگئے اور مدراس کی صحافت میں مذہبی عقائد کے مباحث کا بھی چرچا شروع ہو گیا جس نے بعض اوقات مقامی صحافت کو بہت گندہ کر دیا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جنوبی ہند کی اردو صحافت گرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی اردو زبان کا انحطاط بھی شروع ہو گیا چنانچہ اس زمانے کے ایک اخبار منشور محمدی نے اپنی ایک اشاعت میں لکھا کہ :-

> "کس قدر دل خراش حقیقت ہے اور اب بھی یہ واقعہ باعث عبرت ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کشن گری اور دھرم پوری کے علاقے میں اردو کی کس مپرسی کا مقابلہ ستر سال پہلے سے کیا جائے تو افسوس ہوتا ہے کہ ہم روز بروز اپنی زبان اور اپنے علوم سے بے بہرہ ہوتے جاتے ہیں۔"

باوجودیکہ اس زمانے کے اکثر اخبار ریاست حیدرآباد کے حکام اور امراء کی تعریف اور مذمت کر کے ناجائز استحصال کرنے لگے تھے۔ لیکن پھر بھی بعض گوشوں میں سنجیدہ مباحث بھی پیش کئے جاتے تھے۔ مدراس کی صحافت میں پہلی دفعہ اردو زبان میں تعلیم دینے کی تحریک پیش کی گئی، اور نثر آصفی نے حیدرآباد کے متعلق تجویز پیش کی کہ وہاں ذریعہ تعلیم اردو کو بنایا جائے۔ صحافت کے ان گوشوں میں باوجود انحطاط کے اردو زبان کی ترقی کا جذبہ کارفرما تھا۔ اور ان اخبار کا اثر میسور تک پہنچا تھا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا زیادہ وقت دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں گزرا۔ لیکن یہ حکمران بھی اردو کی تحریک سے کچھ نہ کچھ متاثر تھے۔ ٹیپو سلطان نے تو اپنی فوج کے لئے ایک نغمہ اردو میں لکھوایا تھا۔

ملک ہندوستان میں دین کا غازی سلطان ہے
غرق جس کے آب خنجر میں فرنگستان ہے

شادی بیاہ کے گیت بھی جو دہلی اور حیدرآباد میں رائج تھے۔ میسور میں رائج ہو گئے۔ چند شاعر اور نثر نگار بھی پیدا ہوئے حیدرآباد اور مدراس کے بعد ۱۹۴۷ء تک بنگلور بھی اردو زبان کے اہل قلم کا ایک مرکز بنا رہا اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی بنگلور میں شعراء کی تعداد بہت کافی ہے۔ وہاں کے شعراء نے زیادہ تر لکھنؤ کے زبان کا رنگ اختیار کیا۔ لیکن اب وہ رنگ مدھم ہوتا جاتا ہے۔ حال ہی میں بنگلور میں اردو کی ترقی کی تحریک میں کچھ قوت پیدا ہوئی ہے۔ اور گزشتہ سال یہاں مرکزی انجمن ترقی اردو کی ایک شاخ قائم ہو گئی ہے۔ اگر مدراس اور بنگلور یہ دو مرکز اپنی پوری قوت صرف کر دیں تو اس میں شبہ نہیں کہ جنوبی ہندوستان میں اردو کی تحریک بہت آگے بڑھائی جا سکتی ہے۔ اور اس کے لئے بہت وسیع میدان موجود ہے۔ مدراس کی ثقافتی اور تہذیبی تحریکوں کے سلسلے میں بے محل نہ ہوگا۔ اگر ان اداروں اور انجمنوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے جو آخری دور میں یہاں کچھ نہ کچھ کام کر رہی تھیں۔ مثلاً طلبا مدرسہ اعظم کی انجمن جو ایک رسالہ "سفینہ"

بھی نکالتی تھی یا انجمن اسلامیہ جس کے صدر ایک زمانے میں میر ہمایوں جاہ بہادر تھے یا خود مرکزی انجمن ترقی اردو کی شاخ جس کے صدر مولوی محمد علی قصوری اور سکریٹری مولانا عبدالوہاب بخاری افضل العلماء اور مولانا محمد حسین ہوتے تھے۔

مدراس میں اردو زبان کی ترقی اور تنزل کا یہ بہت ہی مختصر پس منظر پیش کر کے اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اردو زبان مدراس کی حیثیت بہا میراث ہے۔ اس کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ اس زبان کی تحریک کا جو احیاء اب کیا جا رہا ہے اس کے متعلق دیکھنا ہے کہ بہ حالات موجودہ اس عہد جدید کا اہل مدراس کو کیا رخ اختیار کرنا چاہئے۔

۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ ہمارے سامنے ہے۔ اس رپورٹ کے بعض پہلو عجیب و غریب ہیں۔ ملکی زبانوں کے معاملے میں جو افراط و تفریط جائز رکھی گئی۔ اور جس طرح خصوصیت کے ساتھ اردو زبان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کا ایک عکس اس رپورٹ کے صفحات پر بھی نظر آتا ہے۔ مردم شماری کے دوران میں یہ شکایت تو عام تھی کہ ان پڑھ لوگوں نے اگر اپنی مادری زبان اردو بتائی تو اس کو شمار کنندہ نے بلا تکلف ہندی لکھ لیا۔ لاکھوں کی مادری زبان کو اس طرح ایک جنبش قلم بدل دیا گیا۔ زیر نظر رپورٹ میں کہا تو یہ گیا ہے کہ اس مردم شماری میں ہندی اردو کا جھگڑا مسئلہ اٹھا سکا۔ اس لئے کہ ہر شہری کو آزادی حاصل تھی کہ وہ اپنی مادری زبان جو چاہے لکھائے اور شمار کنندہ کا یہ فرض تھا کہ وہ اس کے بیان کو بجنسہ درج کرے۔

لیکن خود رپورٹ میں جس طرح اردو کی حیثیت کو گرایا گیا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اردو اور ہندوستانی کے دو جدا خانے بنائے گئے ہیں۔ ایک میں اردو کے اعداد لکھے گئے ہیں اور ایک میں ہندوستانی کے۔ حالانکہ ہمارے ملک کے دستور میں زبانوں کی جو فہرست شامل کی گئی ہے اس میں ہندوستانی کا نام کہیں نہیں آیا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے درحقیقت ہندوستانی اور اردو ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی کا نام پسند کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ دونوں رسم الخط میں یہی زبان سرکاری اور قومی زبان بنائی جائے۔ لیکن جس طرح مہاتما جی کی تعلیمات کا بڑا حصہ خود ان کے عقیدت مندوں نے نظر انداز کر دیا زبان کے مسئلے میں بھی ان کی رائے نظر انداز کر دی گئی۔ تاہم مردم شماری کی رپورٹ میں اردو کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا اور یہ شبہ بیجا نہیں کہ شاید ایسا اس لئے کیا گیا کہ غلط اندراجات کے بعد بھی اردو کے اعداد کو اور زیادہ گھٹایا جائے تاکہ وہ کبھی اردو کی اونچی حیثیت کے استقرار کے لئے سند نہ بنائے جا سکیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ رپورٹ میں تمام ہندوستان کے اندر اردو بولنے والوں کی مجموعی تعداد تقریباً ایک کروڑ ۳۰ لاکھ رہ گئی اور اگر اس تعداد میں ہندوستانی بولنے والوں کی وہ تعداد بھی شامل کر لی جائے جو اردو سے علیحدہ دکھائی گئی ہے تو کل تعداد ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ سے زیادہ نہیں ہو سکتی گویا ساڑھے چار کروڑ کی مسلم آبادی میں بھی ایک کروڑ ۳۰ لاکھ سے زیادہ اردو بولنے والے اور ۹۰ لاکھ سے زیادہ ہندوستانی بولنے والے نہیں۔ باقی ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ کی مادری زبان کوئی دوسری ملکی زبان ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ مختلف علاقائی آبادیوں میں اتنی بڑی تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو اردو سے بیگانہ ہوں۔ ایک تعداد ضرور ایسے مسلمانوں کی ہے جو صرف اپنے علاقے کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن وہ ہرگز اتنی بڑی نہیں ہے۔ علاوہ بریں شمالی ہندوستان کے وہ لاکھوں غیر مسلم کہاں گئے جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اتر پردیش میں جب صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے اردو والوں کے معروضے پر عوام کے ساڑھے بیس لاکھ دستخط حاصل کئے گئے تو اس پر دستخط کرنے والوں کی ایک قابل لحاظ تعداد غیر مسلموں کی تھی۔ غرضیکہ اس طرح مردم شماری کی اس رپورٹ کی صحت اور صداقت بہت مشتبہ ہو جاتی ہے۔

اب اگر خاص ریاست مدراس کے متعلق رپورٹ کے اعداد پر نظر کیجئے تو آپ خود فیصلہ کر سکیں گے کہ وہ کہاں تک حقیقت حال سے قریب ہیں۔ ہر دس ہزار نفوس میں اردو اور ہندوستانی بولنے والوں کی مجموعی تعداد ۲۷۲ بتائی گئی ہے اور ان لوگوں کی تعداد جو ہندی کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں دس ہزار میں صرف ۲۶۔ پھر یہ بھی شکایت کی گئی ہے کہ تامل کے علاقوں میں تقریباً ۵ لاکھ آدمیوں نے اپنی مادری زبان اردو بتائی حالانکہ وہ تامل ہے۔ یہ بیانات اور یہ اعداد جو پیش کئے گئے ہیں کہاں تک صحیح ہیں۔ اس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔

رپورٹ میں ریاست مدراس کے اردو والوں کی تعداد ۸ لاکھ ۹۰ ہزار اور ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد ۷ لاکھ ۰۰ ہزار بتائی گئی۔ گویا اگر ہندوستانی کو اردو سے جدا نہ کیا جائے تب بھی اردو والوں کی تعداد ساڑھے پندرہ لاکھ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ان اعداد کی جانچ بھی اس کانفرنس کے کارکن ہی بہتر طریقہ سے کر سکتے ہیں۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جس ریاست میں کئی صدیوں سے اردو زبان رائج ہے۔ اور ایک صدی سے زیادہ اس کے عروج کو زمانہ گزرا ہے وہاں اردو بولنے والوں کی تعداد یقیناً اس تعداد سے زیادہ ہوگی۔ ۶ کروڑ کی آبادی میں اردو والوں کی تعداد کا صرف ۱۵ لاکھ ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال یہ کام اس کانفرنس اور مدراس میں اردو کے حامیوں کا ہے کہ وہ ان اعداد کی صحت کو جانچیں اور اردو والوں کے صحیح اعداد پیش کریں۔

اب میں اردو کے تحفظ اور ترقی کے عام مسائل پر مختصراً آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کے دستور اساسی نے تمام زبانوں کو ترقی کے یکساں مواقع بہم پہونچانے کی ضمانت دی ہے اور اس اصول کے تحت تقریباً تمام علاقائی زبانیں

جو کر رہی ہیں۔ جن ریاستوں میں ان کی حیثیت اتنی اہم ہے جتنی کہ اردو کی اتر پردیش میں۔ وہاں ان علاقائی زبانوں کو سرکاری زبان ہندی کے مساوی حقوق دیئے گئے ہیں۔ اور سوائے اردو کے کوئی زبان نہیں ہے جس کی جائز اور صحیح علاقائی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہو۔ لیکن اتر پردیش کے ہندی دوستوں کو خدا جانے کیوں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اردو کا وجود خود اس علاقے میں ہندی زبان کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اس احساس کمتری کے تحت انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ اردو کو میدان سے بالکل ہی ہٹا دیا جائے۔ حکومت کا اقتدار ان کا معاون ہوا۔ اور چار پانچ سال تک یہ منظم کوشش رہی کہ اتر پردیش میں اردو زبان کو اتنا گرایا جائے کہ یہ زبان اور اس سے جو تہذیبی روایات وابستہ ہیں وہ پھر کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔ اردو کی مخالفت کا یہ سوچا سمجھا ہوا نقشہ تھا جس پر عمل کیا گیا۔ لیکن آخر کار مرکزی انجمن ترقی اردو کو میدان میں آکر ان سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا اتر پردیش میں اردو کی علاقائی حیثیت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ ہم نے دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اس مطالبہ کی نوعیت یہ ہے کہ اردو زبان کو چونکہ دستور مسلمہ علاقائی زبانوں کی فہرست میں شامل کر چکا ہے۔ اس لئے اس کی علاقائی حیثیت تو یقیناً مسلم ہے۔ لیکن سوال صرف اتنا باقی رہتا ہے کہ وہ کس علاقے کی علاقائی زبان ہے۔ اس بات کا فیصلہ کرنے کا اختیار دستور نے ریاستی حکومتوں کے بجائے صدر جمہوریہ کو دیا ہے اس لئے درحقیقت ہمارے مطالبے کی روح صرف یہ ہے کہ جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد قابل لحاظ ہو اس کو وہاں علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔ ہم نے اپنی یادداشت میں جو مطالبے پیش کئے ہیں۔ وہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

(۱) ابتدائی تعلیم میں بچوں کی مادری زبان کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔ (اس اصول کو صوبوں کے وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں تسلیم کیا جا چکا ہے۔ لیکن اتر پردیش میں اور بعض دوسری ریاستوں میں علانیہ اس اصول کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے)

(۲) اردو پڑھانے والے استادوں کی ٹریننگ کا کافی انتظام کیا جائے۔

(۳) اردو کی درسی کتابوں کے لکھوانے اور شائع کرنے کا انتظام کیا جائے

(۴) ایسے ثانوی مدارس جن میں اردو کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے سرکاری طور پر تسلیم کئے جائیں اور ریاستی حکومتیں ایسے مدارس کو امداد دیں۔

(۵) اتر پردیش میں کم از کم ایک یونیورسٹی ایسی ہو جس میں بتدریج ذریعہ تعلیم اردو کو بنایا جائے۔

(۶) ایسے اداروں کی مدد کی جائے جو اعلیٰ تعلیم کے علاوہ ادب اور سائنس کی کتابوں کی اشاعت اردو زبان میں کرتے ہیں۔

(۷) اردو کے ممتاز اہل قلم کی سرکاری انعامات اور وظائف کے ذریعے سے ہمت افزائی کی جائے۔

(۸) سرکاری اور امدادی کتب خانوں میں اردو کی کتابیں رکھی جائیں۔

(۹) دفتروں اور عدالتوں میں اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کی جائیں۔

(۱۰) اہم سرکاری اعلانات و قوانین وغیرہ اردو میں بھی شائع کئے جائیں۔

ان مطالبات کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ شاید آپ بھی اپنی ریاست کے حالات کا لحاظ کرکے ان مسائل کے متعلق ایسے اضلاع کے لئے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد قابل لحاظ ہو، ریاستی حکومت سے ایسے حقوق طلب کرنے کی کوشش کر سکیں۔

اردو زبان کا مسئلہ سارے ہندوستان کا مسئلہ ہے کسی ایک ریاست یا صوبہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں اس زبان کو اور اس کی تہذیبی روایات کی حفاظت کرنے کے لئے اپنی ایک تنظیم بھی کل ہند اساس پر قائم رکھنی ہوگی۔ جہاں تک اس مسئلے کے متعلق انصاف اور حقوق کا سوال ہے اس کی نوعیت ہر جگہ یکساں ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ مرکزی انجمن اور اس کی ریاستی شاخوں کے درمیان ایسا اتصال پیدا ہو جائے کہ علی گڑھ میں جب ایک بٹن دبایا جائے تو گھنٹی کی آواز ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ جائے۔ اس لئے میری یہ خواہش ہے کہ ہندوستان کی ہر ریاست میں مرکزی انجمن کی ایک باقاعدہ شاخ قائم ہو جائے اس وقت راجستھان، اتر پردیش، بہار، بمبئی اور حیدرآباد میں یہ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ اور جس دن مدراس میں بھی کوئی اپنی شاخ قائم ہو گئی تو ہماری تنظیم کی یہ ایک اور کڑی مضبوط ہو جائے گی۔

دوستو!

ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت حال کو نظر انداز نہ کیجئے کہ قوموں کی زبانیں نہ تو حکومتوں کے بنائے بنتی ہیں اور نہ ان کے بگاڑنے سے بگڑتی ہیں۔ یہ رائج الوقت سکے ہیں جو اسی وقت تک چلتے ہیں جب تک بازار میں ان کی مانگ ہو۔ جس زبان کو عوام پسند کریں گے۔ وہ قائم رہے گی جو زبان عوام سے دور ہو جائے گی وہ فنا ہو جائے گی۔ اکثر لوگوں میں، ہم ہر چیز حاصل کرنے کے لئے حکومتوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا رجحان پاتے ہیں۔ یہ عادت ہمیں انگریزوں کی حکومت نے سکھائی ہے۔ اس کا فائدہ اسی میں تھا کہ ہم ہر چیز کے لئے اس کے دست نگر رہیں۔ لیکن وہ وقت گزر گیا۔ ہم اب آزاد ہیں اور آزادوں کی عادتیں اور خصلتیں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ اب ہم کو ہر کام کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے اور اپنے مستقبل کو کسی حکومت یا سیاسی پارٹی کے رحم و کرم پر منحصر نہ رکھنا چاہئے۔ جب میں سنتا ہوں کہ اب مسلم اقلیت کے لئے سرکاری ملازمتوں میں جگہ باقی نہیں تو میں خوش ہوتا ہوں کہ یہ ایک بری عادت ہے کہ ہمارے ہر نوجوان کی زندگی کا مقصد سرکاری ملازمت حاصل کرنا تھا۔ اب ترک کرنی پڑے گی۔ اور کوئی سہارا لئے بغیر ہم کو کھڑا ہونا

پڑے گا۔ شروع میں یقیناً بہت سے تکلیف دہ معاشی اور اقتصادی مسائل پیدا ہوں گے۔ اور ہو رہے ہیں۔ لیکن آخر کار ہم عزت نفس اور خودداری کے سیدھے اور سچے راستے پر آجائیں گے۔

اردو کو زیادہ مقبول اور عوامی بنانے کے متعلق مجھے دو باتیں آپ سے کہنی ہیں۔ اول تو زبان کو آسان بنائیے جو ہندی الفاظ اردو کے مزاج کے مطابق ہوں ان کو بلا تکلف اردو میں شامل کرنا چاہئے۔ اور صرف ایک ہی مقصد کو اپنے سامنے رکھنا چاہئے کہ ہماری زبان اتنی آسان اور سلیس ہو کہ عوام اس کو پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔ یہی زبان کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اردو زبان کی جڑیں ہندوستان کی مشترکہ قومی زندگی میں بہت گہری جا چکی ہیں۔ لیکن وہ جڑیں خشک ہو سکتی ہیں اگر ان کو صحیح غذا نہ ملے اور ان کی غذا عوام کی تائید ہے۔ آپ واقف ہوں گے کہ اس وقت ہندوستان میں اردو زبان کے مخالف اخبار بھی اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ مخالفین مجبور ہیں کہ مخالفانہ پروپیگنڈہ کرنے کے لئے اسی زبان کو اختیار کریں جو ملک میں زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ بغیر اس کے ان کا پروپیگنڈہ عوام کی زیادہ تعداد تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ وہ اردو زبان ہی کو اپنی اردو دشمنی کے لئے بھی اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہوں گے کہ سینما کے ۹۰ فیصد فلم اردو زبان میں صرف اس لئے تیار کئے جاتے ہیں کہ کسی دوسری زبان میں وہ مقبول نہیں ہوتے اور فلم بنانے والوں کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوتے۔ اردو زبان کی یہ اصلی طاقت ہے جس پر ہمیں پورا پورا اعتماد کرنا چاہئے۔

دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اردو زبان کی اشاعت اور توسیع کے لئے صرف کانفرنسوں اور مشاعروں کو ذریعہ نہ بنائیں بلکہ تعمیری کام یہ ہے کہ اپنے علاقوں میں مکتبوں، مدرسوں اور کتب خانوں کا ایک جال بچھا دیجئے۔ تاکہ آپ کے بچے مادری زبان سے کسی اثر اور قوت کے تحت بیگانہ ہونے نہ پائیں۔ میں مشاعروں کی افادیت کا ایک حد تک قائل ہوں لیکن شہد بھی اگر ضرورت سے زیادہ کھایا جائے تو نقصان کرتا ہے۔ میں ہمیشہ اردو کے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ کسی کاروبار کو کامیابی سے چلانے کے لئے دکان پر بہت بڑا سائن بورڈ لگانا مناسب ہوتا ہے لیکن اگر دکان کے اندر مال نہ ہو تو وہ سائن بورڈ بیکار ثابت ہوگا۔ یہی حال مشاعروں اور ادبی اجتماعات کا ہے۔ زبان کے پروپیگنڈے کا وہ بہت اچھا ذریعہ ہیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ ہی ساتھ تعمیری اور بنیادی کام نہ ہو تو سستی قسم کی تفریح کے علاوہ کچھ نہیں رہ جاتے۔ آپ اس کانفرنس میں یقیناً کچھ تجاویز منظور کریں گے۔ لیکن ان کی قیمت اور ان کا وزن اس کاغذ سے بھی زیادہ نہ ہوگا جس پر وہ لکھی جائیں گی۔ تاوقتیکہ ان کے پیچھے عمل کا جذبہ بھی کارفرما نہ ہو۔ میرے تلخ تجربے مجھے بہت ہو چکے ہیں کہ میں بڑی بڑی کانفرنسوں میں حاضر ہوتا ہوں۔ خود بھی تقریریں کرتا ہوں۔ دوسرے اردو دوستوں کی تقریریں بھی سنتا ہوں۔ قراردادیں منظور ہوتی ہیں۔ پروگرام بنائے جاتے ہیں۔ لیکن جب میں وہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں تو تین مہینے تک اس اجتماع کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ معاف فرمائیے۔ صاف بات کو صاف ہی کہنا چاہئے میں اہل مدراس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ اور یہ جانتا ہوں کہ مدراس میں اہل علم و فضل اور اردو کے شیدائیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بات اتنی ہی ہے کہ وہ سب ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ایک سوچے سمجھے ہوئے دستور العمل کے تحت کام شروع کریں۔ بعض غلط فہمیاں ایسی ہیں جن کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ بعض متعصب ہندی کے حامیوں کو ہم پر یہ الزام لگانے میں باک نہیں ہوتا کہ ہم ہندی زبان کے مخالف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہندی زبان کے مخالف صرف وہ لوگ ہیں جو ہندی کی صورت مسخ کر کے اس کو سنسکرت کے موٹے موٹے اور مشکل الفاظ سے گرانبار کر رہے ہیں۔ اور اس طرح اس کو عام فہم بنانے کے بجائے اتنا مشکل بنا رہے ہیں کہ خود غیر مسلم اکثریت بھی اس کو نہ بول سکتی ہے اور نہ سمجھ سکتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی رجعت پسندی درخت کی اس شاخ کو کاٹ رہی ہے جس پر انھوں نے اپنا آشیانہ بنایا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ آج ہندوستان میں شاید ایک مسلمان بھی نہیں جو ہندی کو اپنے ملک کی سرکاری زبان تسلیم نہ کرتا ہو۔ لیکن یہ قدرتی جذبہ تو ہر ملکی اور علاقائی زبانوں کے متعلق موجود ہے کہ ہندی کے مفاد پر علاقائی زبانوں کو قربان نہ کیا جائے اس لئے کہ ہر جگہ علاقائی زبانوں میں تہذیب و تمدن اور کلچر کی روایات کے جو خزانے جمع ہو گئے ہیں ان کو برباد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سب ہماری قومی زندگی کی میراث ہیں اور ان کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ یہی بات اردو والے بھی کہتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو شروع ہی سے تمام اردو والوں پر زور دیتی رہی ہے کہ وہ سرکاری زبان کے سیکھنے اور اپنانے میں ذرا بھی تساہل نہ کریں۔ لیکن اپنی مادری زبان کی حفاظت اور ترقی کا بھی پورا پورا لحاظ رکھیں۔ اس جذبے کا نام ہندی دشمنی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میری نظر میں اردو زبان کی حفاظت عین حب وطن ہے۔

یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ جس کو آزاد ہندوستان کے دستور نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ہمارے ملک کی تہذیب ایک مشترکہ اور مرکب تہذیب ہے جو صدیوں تک چند بڑی تہذیبوں کے میل جول سے تعمیر ہوئی ہے یہ ہندوستانی کلچر کا ایک خاص امتیاز ہے اور جب تک ہمارے ملک کے رجعت پسند ہماری تاریخ کے تمام اوراق کو جلا دیں اور اس طرح مٹا دیں کہ اس کا نام و نشان باقی نہ رہے یہ مشترکہ تہذیب ان کے حملوں کا پورا پورا مقابلہ کرے گی اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس مشترکہ تہذیب کی حفاظت ہندوستان کے ہر وفادار شہری کے حب وطن کا تقاضہ ہے اردو زبان بھی اسی مشترکہ تہذیب کی یادگار ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جو لوگ اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کے لئے جدوجہد کر رہے

تھا۔ وہ اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

کہنے کو تو ابھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اب میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا صرف اتنی بات اور کہوں گا کہ اردو کے بعض چوٹی کے بدلتے ہوئے زمانے کا یہ اثر پڑا ہے کہ وہ اردو زبان کے مستقبل سے مایوس ہوتے جارہے ہیں۔ یہ ان کی کم ہمتی ہے وہ نہیں جانتے کہ عوام کے دلوں میں گہرائی میں اس زبان کی جڑیں کس قدر مضبوط ہیں۔ وہ اپنی اقلیت کے عام حالات سے آزردہ خاطر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ ہندستان کی ایک ہزار سالہ کی تاریخ میں ہم پر کتنے وقت ایسے آئے ہیں اور گزر گئے ہیں۔ بدترین زمانہ ۱۸۵۷ء کا تھا جب ہمارے سامنے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ لیکن ہم اس ظلمت سے نکل کر پھر روشنی میں آئے اور پھر ہم نے اس ملک کی اجتماعی زندگی میں ایک مقام حاصل کیا۔ ہر نشیب کے بعد فراز اور ہر رات کے بعد صبح ضروری ہے۔ بشرطیکہ ہم ہمت نہ ہاریں اور اپنے کو ایک مجبور اور لاچار اور بے دست و پا اقلیت سمجھ کر اپنے گھروں اور حجروں میں نہ بیٹھ رہیں۔ درحقیقت ہم ۴ کروڑ انسانوں کی تعداد کو عام سیاسی اصطلاح میں اقلیت کہنا ہی غلط ہے پس اگر ہم ہمت سے کام لیں تو ہمارے مستقبل کا راستہ کوئی طاقت بند نہیں کرسکتی تاوقتیکہ ہماری کم ہمتی خود اس راستے سے ہمیں نہ بھٹکا دے۔

یہ جرم ہے یہاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
بڑھ کر جو اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے!

انجمن کی خبریں

غازی پور

وزیر تعلیم یوپی شری ہرگوبند سنگھ سرکاری دورے پر تشریف لائے۔ اور پرائمری اور جونیر ہائی اسکولوں کی سالانہ تقریب میں شرکت کی۔ جمعیۃ علمائے غازی پور کے وفد نے جس میں مولانا ابوالحسن صاحب صدر ضلع جمعیۃ، مولوی علیم الدین صاحب انصاری، محمد انوار الحسن صاحب صدر انجمن ترقی اردو، مولوی [illegible] صاحب حیاری ناظم اعلیٰ ضلع جمعیۃ شامل تھے۔ وزیر موصوف سے ملاقات کی اور اردو تعلیم کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کے سدباب کی طرف توجہ دلائی۔ وفد نے ایک میمورنڈم بھی پیش کیا جس میں مطالبہ کیا گیا ہے ۱۔ جونیر ہائی اسکولوں میں اردو کو لازمی یا اختیاری مضامین میں شامل کیا جائے۔ ۲۔ دس طلبا کی شرط کی بجائے پانچ کی شرط رکھی جائے۔ ۳۔ اسلامیہ پرائمری اسکول سید پور کو جونیر کیا جائے۔ ان کے علاوہ اور بھی [illegible] اہم مطالبات پیش کئے گئے۔

امروہہ

سال ۱۹۵۵ء کے لئے انجمن ترقی اردو شاخ امروہہ کے لئے حسب ذیل عہدے داروں کا انتخاب ہوا۔

صدر:۔ جناب حکیم آفتاب احمد خاں صاحب جائسی

نائب صدر:۔ سید تقی حسن صاحب نقوی، بی۔ اے

سکریٹری:۔ سید قمر رضی صاحب نقوی۔

جوائنٹ سکریٹری:۔ سرور علی صاحب شبنم عتیقی

خازن:۔ الحاج قاضی سید محبوب احمد صاحب عباسی قاضی شہر۔

آڈیٹر:۔ سید مختار حسین صاحب ایم۔ اے۔ ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ انٹر کالج۔

مجلس عاملہ:۔ (۱) حضرت مولانا سید محمد عبادت صاحب مجتہد العصر پرنسپل دارالعلوم سید المدارس امروہہ (۲) حضرت مولانا نسیم احمد صاحب فریدی رئیس دارالافتاء جامعہ اسلامیہ امروہہ (۳) مولانا سید صفی مرتضیٰ صاحب پنشن ٹیچر آئی ایم ہائر سکینڈری اسکول (۴) مولوی صدر الدین احمد صاحب صدیقی ممبر مجلس عاملہ صوبائی انجمن ترقی اردو (۵) حکیم کلب علی صاحب شاہد (۶) حکیم سید شہرت حسن صاحب رضوی (۷) منشی سعادت اللہ صاحب (۸) حکیم حیات اللہ صاحب (۹) مہیش چندر صاحب گوئل (۱۰) سید احسان احمد صاحب (۱۱) جناب تاباں نقوی مدیر نوائے ہند امروہہ (۱۲) عزیز احمد عباسی۔

دیوبند

۲۶ جنوری کو جشن جمہوریت کی مسرت میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دیوبند کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ زیر صدارت پروفیسر جہاں پرشاد صاحب (صدر انجمن) منعقد ہوا جس میں ممتاز و قادرالکلام شعرائے کرام کے علاوہ دیوبند کے بہت سے جواں سال و جواں فکر شاعروں نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ قابل ذکر شعراء کے نام یہ ہیں۔

عامر عثمانی۔ زبیر افضل عثمانی۔ بشیر کاسگنجوی۔ حفیظ دیوبندی۔ قمر عثمانی۔ ابوالمزاح حضرت کاتو دیوبندی۔ ارشاد نسیم۔ اکبر عثمانی۔ شعلہ صدیقی۔ نسیم عثمانی۔ یوسف عثمانی۔ شمیم عثمانی۔ مشہود اقبال عثمانی۔ عثمان رہرو۔ وغیرہ۔

مشاعرہ گاہ کے وسیع میدان پر شامیانے نصب کئے گئے تھے اور برقی قمقموں سے آراستہ کیا گیا تھا رات کے تقریباً ایک بجے یہ کامیاب مشاعرہ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

نان پارہ

۲۰ جنوری ۱۹۵۵ء کو انجمن ترقی اردو نان پارہ نے اپنے ایک خصوصی اجلاس میں یہ تجویز منظور کی۔

"انجمن ترقی اردو نان پارہ کا یہ مخصوص جلسہ دستخطی مہم کے قائد ادب اردو کے سچے پرستار اور انجمن ترقی اردو صوبہ اتر پردیش کے صدر محترم پنڈت کشن پرشاد کول کی ناگہانی موت پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ پنڈت جی موصوف نے اردو زبان و ادب کی جو گراں قدر خدمات

انجام دی ہیں اور اس اردو بیزاری کے زمانے میں جس بہادری سے اردو تحریکات میں حصہ لے کر جد وجہد اور استقلال کی جو اعلیٰ مثال پیش کی ہے یہ جلسہ اس پر زبردست خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ اور ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کرتا ہے۔"

دہلی

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی کی پندرہ روزہ نشست ۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء بوقت ۶ بجے شام زیر صدارت حضرت منور لکھنوی علی منزل کوچہ پنڈت میں ہوئی۔ سب سے پہلے متفقہ طور پر مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔

"انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے اراکین کو ہندو پاکستان کے مشہور ادیب اور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی ناگہانی وفات کی خبر سن کر بے حد رنج و قلق ہے۔ انجمن کے اراکین منٹو صاحب کی وفات کو اردو ادب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان سمجھتے ہیں اور اس سانحہ عظیم پر مرحوم کے پسماندگان و لواحقین کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔"

بعد ازیں انجمن کے سالانہ جلسے کی رپورٹ قدیر احمد نے پڑھ کر سنائی۔ مجوزہ پروگرام کے تحت محترمہ ذکیہ ساز صاحبہ نے ایک غزل سنائی جو کافی پسند کی گئی۔ محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ جنرل سکریٹری انجمن "بدلتے ہوئے ناگ دیوتا" کے عنوان سے ایک طویل لیکن دلچسپ اور تحقیقی افسانہ پڑھ کر سنایا جو بیحد مقبول رہا۔ منور لکھنوی صاحب و شہریار پرواز صاحب نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

نشست کے خاتمے پر فیصلہ کیا گیا کہ اس سال یوم غالب فروری کی بجائے مارچ میں منایا جائے اور مشاعرے اور بزم مقالات کی بجائے غالب کی زندگی اور ان کے ماحول کو اچھے پیمانے پر اسٹیج کیا جائے۔ نیز پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ۔ ع۔ انصاری صاحب ایڈیٹر شاہراہ و دیگر حاضرین نے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

اردو شعر و سخن کے پرستاروں سے اپیل

ہندوستان کے صاحب عرفان شاعر حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی کی خدمات شعر و سخن

کا اعتراف اور اہل ملک خراج عقیدت

حضرت امجد اردو کے ان چند باکمال اور صاحب دل شاعروں میں سے ہیں جنھیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے۔ آپ کی شاعری کا محور اخلاقیات اور روحانی تعلیم ہے۔ رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں آپ کا جواب نہیں اسی لئے آپ کو ثانی سرمد کہا جاتا ہے۔

حضرت امجد نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر بلکہ ایک خدا ترس اور صاحب باطن صوفی ہیں۔ آپ کا کلام مایوس دلوں کے لئے سکون کا باعث ہوتا ہے۔ ملک کے ایسے نامور صاحب عرفان شاعر کی خدمات شعر و سخن کا اعتراف کرنے کے لئے ادارہ ادبیات اردو نے ۱۲ جنوری ۱۹۵۵ء کو شام کے ۶ بجے اعظم ہال سٹی کالج میں حضرت امجد کی ڈائمنڈ جوبلی منانے کا تصفیہ کیا ہے۔ اس جلسے کی صدارت افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن مدراس سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فرمائیں گے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور سپاس نامہ پڑھیں گے حضرت امجد کی حیات اور کلام پر مقالے اور نظمیں سنائی جائیں گی۔ جو بعد کو کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کی جائیں گی کلام امجد کو ملک کے فنکار سازوں پر پیش کریں گے۔ حضرت امجد کی خدمت میں کیسہ زر بھی پیش کیا جائے گا جو ہم سب کی طرف سے خراج عقیدت ہوگا اسی رات میں ایک خاص محفل شعر و سخن ہوگی۔

علم دوست احباب سے استدعا ہے کہ اس مبارک تقریب میں ہمارا تعاون فرمائیں اور کیسہ زر کی فراہمی میں زیادہ سے زیادہ رقم بطور عطیہ دے کر اپنی اردو نوازی کا ثبوت دیں۔ اس قسم کے مواقع بار بار نہیں آتے اور یہ حیدرآباد کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تقریب ہے اس لئے ہمیں اسے شایان شان پیمانے پر منا کر زندہ قوم ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ معطین کے نام سپاس نامے میں چھپیں گے۔

محمد اسد اللہ الخبیر

(صدر ڈائمنڈ جوبلی کمیٹی)

عطیوں کی رقم مندرجہ ذیل اصحاب کے یہاں روانہ کی جا سکتی ہے

(۱) سیٹھ احمد غریب معتمد انجمن خدام النبی بمبئی

(۲) اسمٰعیل شریف صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر خلاصی پالم بنگلور

(۳) سیٹھ محمد ایوب (محمد یونس اینڈ سنس) احمد آباد

(۴) سیٹھ ایچ۔ ایم حسین جیس اسٹریٹ سکندرآباد
(۵) ملا فدا علی پٹرول مرچنٹ بازار سدی عنبر
(۶) محسن علی پٹرول پمپ، بنجبہ گٹہ
(۷) اعظم معین الدین جنرل مرچنٹ عابد روڈ
(۸) مرزا احمد علی بیگ تاجر پارچہ چارمینار
(۹) عبدالستار ماڈرن پریس ابجل گنٹہ۔
(۱۰) ڈاکٹر عبدالمنان مالگزاری روڈ۔
(۱۱) مرزا احسن علی غازی کنٹراکٹر دارالحرمت دبیر پورہ
(۱۲) حاجی قربان حسین عابد روڈ۔

انجمن کی نئی مطبوعات

باپو کے قدموں میں

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد نے گاندھی جی کے ساتھ اپنی ابتدائی سیاسی زندگی کا حال بہت دلچسپ پیرائے میں لکھ کر شائع کیا تھا لیکن وہ کتاب دیوناگری رسم خط میں تھی۔ اس لئے محترم صدر کی اجازت سے انجمن نے اس کو اردو خط میں منتقل کیا ہے

طباعت بہترین ٹائپ کی ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انجمن نے اس سے زیادہ زیب اور خوبصورت کتاب ابھی تک کوئی اور شائع نہیں کی۔ فاضل سوانح نگار کے اعلیٰ مرتبے کا لحاظ کرکے انجمن نے اس کتاب کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے ڈاکٹر راجندر پرشاد کے قلم سے گاندھی جی کی تعلیمات کا یہ مطالعہ بہت ہی دلچسپ ہے اور اس قابل ہے کہ ملک کے ہر کتب خانے میں جگہ پائے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ہر حصے کی قیمت (پانچ روپیہ ہے۔ اور مکمل سٹ کی قیمت ۱۵ روپے)

نفسیات افواہ

اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر معتمد ولی الحق صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے لکھی ہے۔ اس میں افواہوں کی نوعیت کا نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کیا گیا ہے قیمت ۱/۸ روپے

حیات اجمل

اس کے مرتب قاضی محمد عبدالغفار صاحب ہیں۔ اس سوانح حیات کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ اس میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی صرف سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ اس دور کی پوری سیاسی تحریکات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں حکیم صاحب مرحوم کے عظمت و کردار کا پتہ چلتا ہے۔

اس کتاب کی بڑی خوبی مصنف کے انداز بیان کی دلکشی بھی ہے جس کے متعلق بمبئی کے انگریزی اخبار بھارت نے لکھا ہے

"قاضی محمد عبدالغفار نے جو اردو کے بہت بڑے عالم اور انشا پرداز ہیں۔ ایک عظیم الشان شخصیت کی سوانح حیات لکھ کر بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ کتاب اس زمانے کی سیاسی انقلابات کی ایک مستند تاریخ ہے اور پرلطف اردو میں لکھی گئی ہے۔" (قیمت مجلد آٹھ روپے)

سیاسیات کے اصول (حصہ اول و دوم)

مرتبہ پروفیسر ہارون خاں شروانی

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ سیاسیات کے اصولوں پر اردو زبان میں ایک مستند تالیف ہے جو اس موضوع کے ایک ممتاز ماہر کے قلم سے مرتب کی گئی ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں راج یا مملکت کے متعلق نظریات اور دوسرے میں حکومت کے اجزائے ترکیبی پر بحث کی گئی ہے اور دنیا کے مختلف دستوروں پر خصوصاً اپنے ملک کے نئے جمہوری دستور سے مثالیں دے کر حکومت کے مختلف حصوں کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں (جو ابھی تیار نہیں ہے) بین المملکت کے اصول کی تاریخ اور اس کے موزوں روپ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں سات سو کے قریب سیاسی اور دوسری اصطلاحوں کی دو فرہنگیں بطور ضمیمہ کے منسلک ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔ اور یقیناً وہ عام پڑھنے والوں اور طلبا دونوں کے لئے بہت مفید ہے۔ کتاب کے دو حصے جو اب شائع کئے گئے ہیں بجائے خود مکمل ہیں۔ (قیمت فی حصہ دو روپے)

(پرنٹر پبلشر قاضی عبدالغفار نے نیشنل پرنٹرس کمپنی میں چھپوا کر مرکزی انجمن علی گڑھ سے شائع کیا)